جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

علامہ سید سلیمان ندویؒ

خان یاسر

امی، ابّی اور دادا کے نام

جن سے میں نے سیکھا کہ
عظیم شخصیات
آسمان سے نہیں اترتیں
بلکہ
زمین پر پیدا ہوتی ہیں،
زمین سے وابستہ ہوتی ہیں؛
اور یہ کہ
ہر بچہ
اگر 'چاہے'
تو 'بڑا' آدمی بن سکتا ہے...

میری ہستی شوقِ پیہم میری فطرت اضطراب
کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں

”ملک میں اس وقت علم و مذہب کے تعلق سے جو خیالات بھی پھیلے ہوئے ہیں، وہ بالکل غیر معتدل ہیں۔ کچھ ایسے اشخاص ہیں جو عقل پرستی کے غرور میں مذہب اور مذہبی علوم کے ساتھ جاہلانہ تمسخر کرنے سے نہیں شرماتے، دوسری طرف حامیان مذہب و علوم مذہبی کا جمہور اعظم ہے، جو عقل و علم، مصالح و حکم، فلسفہ و اسرار کی ضرورت سے منکر ہے۔ ملک میں دونوں قسم کے لوگوں کے مضامین اور تصنیفات ہر روز شائع ہوتی ہیں۔ ہماری جماعت صلح عام کی منادی ہے، وہ دونوں فریقوں کو مصالحت کی دعوت دیتی ہے۔ وہ جدید علوم، تازہ خیالات اور نئی تحقیقات کی بجان و دل قدردان ہے لیکن اس کے لیے اپنے بزرگوں کا اندوختہ کھونا نہیں چاہتی ہے۔ یہ ان نادانوں پر ہنستی ہے جو تمام سرمایۂ عمر دے کر بازار فرنگ کی ہر چمکتی ہوئی چیز کے خریدار بن جاتے ہیں۔ لیکن ہماری جماعت ہر چیز کو خریدنے سے پہلے یہ جان لینا چاہتی ہے کہ یہ ہمارے بزرگوں کے تہہ خانوں، خرابوں اور مدفون خزانوں میں موجود تو نہیں ہے۔ اگر ہے، تو وہ کون احمق ہوگا جو گھر میں کی ایک چیز کو چھوڑ کر اس کی تلاش میں گلیوں اور بازاروں کی آوارہ گردی قبول کرے گا۔

دوسری طرف یہ بھی سچ ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے، لوگ اپنی وضع بدل رہے ہیں؛ مذاق، تمدن، معاشرت، تجارت، گفتگو، تہذیب ہر چیز میں ایک نمایاں انقلاب ہے۔ اب اگر دلی کی ایک تنگ و تاریک گلی کے اندر پرانی وضع کی ایک چھوٹی سی دکان میں بیٹھ کر ولی دکنی اور مظہر جانجاناں کی زبان میں ہم اکسیر بھی بیچیں تو کون خریدنے آئے گا۔ ہمارے گزشتہ علوم و فنون کا بعینہ یہی حال ہے، ہم کو بزرگوں کی اس متاع کو لے کر نئے ساز و برگ سے موجودہ طرز کی ایک بڑی شاپ میں شیشہ دار الماریوں کے ساتھ اپنی دکان سجانی چاہیے۔“[12]

(سید سلیمان ندوی)

سید سلیمان ندوی

پیدائش اور بچپن: سید سلیمان 23 نومبر 1884 میں دیسنہ صوبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اوائل سے ہی رائج بدعات کے خلاف معرکہ آرا رہے۔ ہر ہفتے ننھے سلیمان عورتوں کو تقویۃ الایمان پڑھ کر سناتے، اور پردے کے پیچھے سے ان کے بڑے بھائی درس دیتے۔ ایک مرتبہ انھوں نے محرم کی غیر شرعی رسموں کے خلاف ایک تحریر لکھ کر ایک دوست کے ہاتھ کسی بزرگ کو بھجوادی جس سے ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ ویسے سید صاحب فطرتاً سنجیدہ، متین اور خاموش مزاج تھے، کھلنڈرے اور آوارہ لڑکوں سے میل جول نہ تھا۔ کبڈی اور بیت بازی سے البتہ دلچسپی تھی۔ 1898 میں اسلام پور پھر پھلواری شریف گئے جہاں انھوں نے **مدرسہ امدادیہ** میں داخلہ لیا۔ یہاں تقریر وتحریر کی انجمن میں جم کر شرکت کی، کئی تقریریں کیں، متعدد مضامین شائع ہوئے۔ 1901 میں **ندوۃ العلماء** میں داخل ہوئے۔ سید صاحب اب تک ایک متوسط درجے کے طالب علم ہی رہے تھے۔ حساب سے انھیں خدا واسطے کا بیر تھا لیکن سارا وقت مطالعے میں صرف ہوتا۔ یکسوئی اعلیٰ معیار کی تھی، ادب سے دلچسپی تھی، درس کے علاوہ بھی اساتذہ خصوصاً مولانا فاروق چریا کوٹی سے استفادہ کرتے۔ اردو عربی تقاریر، مضمون نگاری، عربی سے ترجمہ، شعر وشاعری... الغرض ندوہ میں سید سلیمان کے جوہر کھلے، حتی کہ وہ طلبہ کی مختلف انجمنوں کے ناظم مقرر ہوئے۔ نواب محسن الملک نوخیز شاعر کے عربی قصیدے، تو علامہ شبلی ان کے فارسی قصیدے سے متاثر ہوئے۔ شبلی کی جوہر شناس نگاہوں نے انھیں تاڑ لیا اور نتیجتاً رسالہ **الندوہ** کے بہت سے کام ان کے سپرد کردیے۔ سید سلیمان کے مضامین لکھنؤ کے **البیان** اور علامہ رشید رضا کے **المنار** میں بھی چھپنے لگے۔ 1907 کے سالانہ جلسے میں انھوں نے ایک تقریر کی جس پر ایک سامع نے اٹھ کر انھیں عربی میں تقریر کرنے کا چیلنج دیا۔ اسے قبول کرکے مولانا نے تقریر کردی۔ علامہ شبلی نے اب سامعین کو چیلنج کیا کہ ہوسکتا ہے لوگ گمان کریں کہ یہ تقریر رٹ کر آئے تھے لہٰذا آپ

موضوع دیجیے اور سلیمان عربی میں تقریر کریں گے۔ چنانچہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہو، اس تجویز کردہ موضوع پر انہوں نے عربی میں ایسی دھواں دھار تقریر کی کہ تحسین و آفریں کے غلغلے بلند ہوئے۔ شبلی نے جوش مسرت سے سرشار ہو کر اپنا عمامہ اتار کر انھیں پہنا دیا۔

میدان عمل: ان کے گھر والے انھیں طب کی تعلیم دلانا چاہتے تھے جس سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ علامہ شبلی نے گھر والوں کو سمجھا بجھا کر انھیں الندوہ کا سب ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ ستمبر 1908 میں وہ دارالعلوم ندوہ میں عربی انشا کے معلم اور اگلے ہی سال ادیب بھی ہو گئے۔ اسی زمانے میں طلبہ کے لیے عربی کی دو ریڈر اور عربی کے نئے الفاظ کا ایک لغت تیار کیا۔ علامہ شبلی نے تاریخ کی نصابی کتب میں مسلمانوں کی غلط شبیہہ کے ازالے اور جاہل مسلمانوں میں ارتداد کی رو کے مقابلے کے لیے **تصحیحِ اغلاطِ تاریخ** اور **مجلس اشاعت و حفاظتِ اسلام** نامی، ندوہ کے دو مستقبل شعبے بنائے۔ سید سلیمان ندوی ان شعبوں کے بالترتیب سکریٹری و جوائنٹ سکریٹری بنے۔ سیرت النبی کی تالیف کے لیے شبلی نے انھیں اپنے عربی کے مددگار کی حیثیت سے منتخب کیا۔ یہ خوشگوار لمحے زیادہ دنوں تک باقی نہ رہ سکے۔ ندوہ کی انتظامیہ، طلبہ کی اسٹرائک اور شبلی کے استعفے سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے بھی ندوہ سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے دیرینہ رفیق مولانا آزاد کے جاری کردہ **الھلال** کے ادارتی عملے میں شامل ہو گئے۔ الہلال میں کانپور مسجد کی شہادت پر ان کا لکھا گیا مضمون انگریزوں کو ایسا ناگوار گزرا کہ الہلال کی ہر کاپی ضبط کر لی گئی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ پونے آ گئے اور **دکن کالج** میں فارسی کے اسسٹنٹ لکچرر ہو گئے۔ یہاں انھوں نے انگریزی پڑھیاں دینا شروع کیا اور ایک یہودی سے عبرانی بھی سیکھنے لگے۔ علامہ شبلی سیرت النبی کی ذمہ داری سلیمان کو سونپ کر دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کا **دار المصنفین** کا خواب بھی ادھورا تھا۔ سید سلیمان نے اپنے استاد کے اس خواب میں رنگ بھرا اور دارالمصنّفین کے پہلے ناظم مقرر ہوئے۔ دارالمصنّفین کی بنیادیں مستحکم کرنے کے بعد انھوں نے دکن کالج پونہ سے استعفیٰ دے دیا اور نومبر 1919 کو اعظم گڑھ پہنچ گئے۔ دارالمصنّفین کے معارف پریس کے قیام کے ساتھ ہی ماہنامہ **معارف** بھی سید صاحب کی ادارت میں شروع ہوا۔ دارالمصنّفین کے پلیٹ فارم سے انھوں نے قوم کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ اعلیٰ پائے کا ریسرچ کتب خانہ، قدیم نوادرات اور مخطوطات کی تلاش اور اشاعت، اردو انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کی کوشش، اردو کانفرنس کے

قیام کا خاکہ...انھوں نے ہر کام دیدہ ریزی اور دور اندیشی سے انجام دیا۔

رهنمائی: 1920 کے اوائل میں اتحادی طاقتوں کے سامنے خلافت کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کے لیے خلافت کمیٹی کا ایک وفد یورپ روانہ ہوا جس میں سید صاحب شامل تھے۔ نامہ نگاروں اور سیاستدانوں بشمول برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج سے ملاقات، گمراہ کن اخباری مضامین اور مستشرقین کے جوابات، ملت اسلامیہ کے دیگر وفود سے گفت وشنید؛ ہر معاملہ میں سید صاحب کا اہم رول رہا۔ اسی سفر میں انھوں نے یورپ کے اہم کتب خانوں اور نظام تعلیم خصوصاً آکسفورڈ اور کیمبرج کا مطالعہ کر کے ان کی ترقی کا راز ان کی غیر نصابی سرگرمیوں کو قرار دیا جس میں مباحثے، مناظرے، جسمانی ورزش دوسرے الفاظ میں شخصیت کا مکمل ارتقاء شامل ہے۔ تحریکِ خلافت کو اپنی تحریروں کے ذریعے انھوں نے بالیدگی بخشی۔ نومبر 1919 میں **جمعیۃ علماء ھند** کا قیام ہوا جس کے بانیوں میں سید صاحب بھی شامل تھے۔ خلافت کمیٹی اور ندوہ کی مجلس انتظامیہ کے باقاعدہ رکن ہونے کے علاوہ آپ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے بھی رکن تھے۔ اسی طرح آپ **جامعہ ملیہ اسلامیہ** کی انتظامیہ کے رکن تھے۔ 1923 میں انھیں ندوہ کا معتمد تعلیم بھی بنا دیا گیا۔ جنگ آزادی میں ان کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ دارالمصنّفین سیاسی سرگرمیوں کا اڈہ سا بن گیا تھا جہاں موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو جیسے بڑے لیڈران اپنے دوروں کے دوران قیام کرتے تھے۔

حجاز میں جب شریف حسین اور عبدالعزیز کی معرکہ آرائیوں سے امن وامان غارت ہوا تو ہندوستان سے سید صاحب کی قیادت میں 1924 کو ایک وفد حجاز گیا۔ 1925 میں عبدالعزیز کی بادشاہت کے قیام کے بعد بھی **مؤتمر اسلامی** کے اجلاس میں انھوں نے خلافت کمیٹی کے وفد کی قیادت کی۔ وہ بادشاہت کے بجائے حجاز میں خلافت کا قیام چاہتے تھے لیکن یہ کوشش بار آور نہ ہوئی۔ مؤتمر اسلامی کا باقاعدہ نظم قائم ہوا تو انھیں اس کا نائب صدر بنایا گیا۔ اکتوبر 1932 میں حکومت افغانستان کی دعوت پر وہاں کے تعلیمی مسائل پر غور وفکر کے لیے آپ افغانستان گئے۔ جون 1934 میں وزیر تعلیم بہار کی دعوت پر عربی مدارس کے نصاب کی ترتیب کے لیے رانچی کا سفر کیا۔ 1935 میں لاہور کا سفر کیا اور انجمن جماعت اسلام کے مجوزہ زنانہ کالج کا خاکہ بنایا۔ ریاست حیدر آباد نے اسلامی فقہ کے قانون قتل وقصاص کی تدوین کے لیے کمیٹی بنائی؛ سید صاحب بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ اس سلسلے میں جولائی

1935 کو حیدرآباد گئے۔نومبر 1936 میں فلسطین کانفرنس دہلی میں دیا گیا ان کا صدارتی خطبہ دنیا بھر میں مقبول ہوا۔جنوری 1940 میں حیدرآباد، پونہ، اور ممبئی کا سفر کیا۔متعدد تعلیمی اداروں کا دورہ اور طلبہ سے خطاب کیا۔مارچ میں اسلامیہ کالج میں عربی دینیات اور طب کی تعلیم کا نصاب تیار کرنے کے لیے پشاور اور بہاولپور گئے۔1941 کے اوائل میں مسلم لیگ اور نواب اسماعیل خاں کی پہل پر اسلام کے سیاسی و اقتصادی نظام کی تدوین کے لیے ایک کمیٹی بنی جو مولانا مودودی، شبیر عثمانی، عبد الماجد دریابادی اور ذاکر حسین جیسے زعماء پر مشتمل تھی۔سید صاحب اس کے کنوینر تھے لیکن بوجوہ یہ کام نا تمام رہا۔فروری 1943 میں مسلم یونیورسٹی نے سید صاحب کی علمی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔دسمبر 1944 کو ہسٹاریکل کانگریس کے اجلاس شعبہ تاریخ زمانۂ وسطیٰ اور فروری 1945 کو جمعیۃ العلماء کے اجلاس کی ممبئی میں صدارت کی۔

سید صاحب دارالمصنّفین کو اپنے خون حیات سے سینچ رہے تھے۔اسے چھوڑنا انھیں گوارا نہ تھا، چنانچہ وہ علی گڑھ، پنجاب اور عثمانیہ یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے تعلیمی عہدوں کو ٹھکرا چکے تھے، لیکن اب دارالمصنّفین کے اندرونی حالات بگڑنے لگے، آپسی رسہ کشی سے سید سلیمان بدظن ہو گئے۔ادھر بھوپال کے بیدار مغز نواب نے عربی مدارس کے اصلاح و تنظیم کی کوشش شروع کی اور سید صاحب کو امیر جامعہ کا عہدہ پیش کیا۔اس سے پہلے وہ قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کر چکے تھے۔کافی اندرونی کشمکش کے بعد سید صاحب نے دونوں عہدے اس شرط پر قبول کیے کہ وہ دارالمصنّفین آتے جاتے رہیں گے۔بھوپال میں ان کا قیام چار سال رہا۔اکتوبر 1949 میں حج کا رخت سفر باندھا، سلطان عبدالعزیز نے باصرار انھیں اپنا خاص مہمان بنایا۔

قیام پاکستان: ان کی نگاہ دوربیں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہندوستان میں آئندہ اسلامی نظام قائم نہ ہو سکے گا لہٰذا وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ مسلمانوں کے خالص مذہبی اور شخصی قوانین کی حفاظت و ترقی واصلاح اور استحکام کے لیے ان کا ایک مستقل نظام منظور کیا جائے۔اصولی طور پر سید صاحب تقسیم کے خلاف تھے کہ اس سے مسلمانوں کے اپنے مفادات کا تحفظ ہی نہ ہو پائے گا، وہ دعوت حق کا فریضہ خاک ادا کر پائیں گے۔ان کے مطابق مسلمان عام معنوں میں کوئی قوم نہیں بلکہ ایک نظریاتی گروہ ہیں، اگر وہ صرف اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین کے بلند تر مقصد کو حرزِ جاں بنالیں تو یہ ان کے تمام

امراض کا مداوا ثابت ہوسکتا ہے۔ان کے بقول: ''**عیسائیوں نے عیسائیت ملنے کے پندرہ سو برس بعد عیسائیت چھوڑ کر سلطنت پالی لیکن مسلمانوں نے تو اسلام اور سلطنت ایک ساتھ پائی اور جب اسلام چھوڑا تو سلطنت بھی چھوٹ گئی۔**''

آزادی کے بعد بھوپال کا پرانا نظام برقرار نہ رہ سکتا تھا، نئے نظام میں سید سلیمان کو عملاً چند جہلاء کے تابع کردیا گیا، جن کی جہالت اور بدسلوکی سے وہ دل برداشتہ ہوگئے۔ پاکستان میں اپنی بیٹی کے پاس کچھ روپے بھیجنے کے 'جرم' میں ان پر مقدمہ بھی چلا، سید صاحب نے استعفیٰ دے دیا اور یکم جون 1950 کو بھوپال سے رخصت ہوگئے۔ پاکستان بننے کے بعد پنجاب یونیورسٹی نے ان خدمات حاصل کرنی چاہیں۔ پاکستانی حکومت نے اسلامی دستور کی تدوین کے لیے ایک بورڈ تشکیل دیا اور سید صاحب کو اس کا صدر بنانا چاہا، ان کے بہتیرے احباب پہلے ہی پاکستان منتقل ہوچکے تھے اور وہاں سے بھی پیہم اصرار تھا۔نواسی کی طبیعت بگڑنے پر سید سلیمان عارضی طور پر پاکستان گئے۔طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے واپسی میں تاخیر ہوئی اور پرمٹ میں توسیع کی درخواست رد ہوگئی۔ان اسباب نے ان کے کراچی میں مستقل قیام کی راہ ہموار کردی۔دسمبر 1950 میں سید صاحب کی صدارت میں مختلف مسالک کے رہنماؤں نے متحدہ طور پر اسلامی دستور کا بنیادی خاکہ پیش کردیا۔جس کے بعد کسی سیکولر دستور کے امکانات معدوم ہوگئے۔ پاکستان میں آپ نے آل پاکستان ھسٹاریکل سوسائٹی کے ایک شعبے کی صدارت کے علاوہ کراچی یونیورسٹی کے ممبر اور ادارہ تعلیماتِ اسلام کے صدر کے فرائض بھی انجام دیے۔

تصانیف: علامہ شبلی سیرت النبی کی ذمہ داری سید سلیمان کو سونپ گئے تھے۔علامہ شبلی کے ہاتھوں لکھی ہوئی پہلی جلد 1918 کو منظر عام پر آئی اس کے بعد 1924، 1932، 1935 اور 1938 میں بقیہ جلدیں شائع ہوئیں جو بالترتیب معجزات، آپؐ کے اصلاحی کام و اسلامی عقائد، اسلامی عبادات کی توضیح اور اسلام کے فلسفۂ اخلاق کی تشریح پر مشتمل ہیں۔ساتویں جلد کا موضوع معاملات و سیاست تھا مگر سلیمان ندوی اسے مکمل نہ کرسکے۔ارض القرآن، سیرت عائشہ، خیام، رحمتِ عالمؐ، حیاتِ شبلی وغیرہ ان کی اہم تصانیف ہیں۔ ان کے متعدد خطبات و مقالات نقوشِ سلیمانی اور مقالاتِ سلیمانی کی کئی جلدوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ اکتوبر 1925 میں آپ نے تعلیم اسلامی انجمن کی

دعوت پر مدراس میں سیرت پر آٹھ خطبے دیے جو **خطباتِ مدراس** کے نام سے شائع ہوئے۔ **عرب و ہند کے تعلقات** اور **عربوں کی جہازرانی** بالترتیب ہندوستان اکیڈمی الہ آباد اور ممبئی گورنمنٹ کے شعبہ تعلیم کی دعوت پر دیے گئے خطبات کا مجموعہ ہیں۔ معارف میں اپنے شذرات کے ذریعے سید صاحب تقریباً نصف صدی تک قلمی جہاد میں مصروف رہے۔ قابل مسلم اساتذہ کی موجودگی میں اونچی قیمتوں پر عربی کے یوروپی اساتذہ رکھنے پر مسلم یونیورسٹی کو آڑے ہاتھوں لینا، حضورؐ پر مرہٹی انسائیکلوپیڈیا کے گستاخانہ اعتراضات پر تبصرہ، نابالغوں کی شادی کے انسداد کے سارداِبل کی مخالفت، اسلامی حکومتوں میں غیر مسلم رعایا کے موضوع پر ڈاکٹر ٹرٹین کی کتاب پر تبصرہ، تاریخ مسخ کرنے والوں کی قلعی کھولنا، ودیا مندر اور واردھا اسکیم کی مخالفت، نیاز فتحپوری جیسے تجدد پسند لوگوں کے 'اجتہادات' کے دندان شکن جواب، مسلمانوں کے لیے لائحہ عمل، کا معاملہ ہو یا اردو زبان کی ترویج و اشاعت ہر جگہ ان کے شذرات طنز کے نشتر سے مزین، تنقید کی سان پر چڑھے ہوئے درپیش مسئلے کا ایسا تجزیہ پیش کرتے ہیں کہ قاری ان کی دوراندیشی کا قائل ہو جاتا ہے۔ مختلف کتب پر تبصرے و مقدمے بالخصوص مولانا الیاس کی سوانح پر ان قلم سے نکلا ہوا مقدمہ بصیرت افروز ہے۔

وفات: سید سلیمان کو جہاد زندگانی میں کبھی آرام نصیب نہ ہوا۔ شمشیرِ قلم تھامے وہ کبھی مسلمانوں کو آمادۂ عمل کرتے نظر آتے تو کبھی اپنے مرشد کی خوابوں کی تکمیل کرتے، کبھی باطل کی سازشوں کو طشت از بام کرتے تو کبھی احیائے دین کے منصوبے پیش کرتے، کبھی کسی مجلس کی صدارت، کہیں خطبہ، کہیں نظامت، کہیں نصاب کی ترتیب...... اکتوبر 1935 میں شدید علیل ہوئے، 1945 میں حوالیٔ قلب میں درد کا شدید دورہ پڑا۔ 1949 میں حج سے واپسی کے دوران جہاز پر سخت بیمار ہو گئے۔ ضعف اعصاب اور معدہ کی شکایت مسلسل تھی۔ ہر بار ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا لیکن سیمابی روح کبھی چین سے نہ بیٹھی۔ فروری 1953 میں اعزہ کی لاکھ مخالفت کے باوجود آل پاکستان **ہسٹاریکل کانگریس** کی صدارت کے لیے ڈھاکہ گئے۔ واپسی پر تنفس کا شدید دورہ پڑا۔ پھر تو یہ دورے مسلسل ہو گئے۔ 23 نومبر 1953 کو مغرب بعد لیٹے ہی تھے کہ دل کا دورہ پڑا اور شبلی کا یہ جانشین اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے علمی کاموں سے ہمیں کما حقہ مستفید ہونے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین!